بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

نظامِ حکومت، خواہ جمہوری ہو یا آمرانہ، حاکمانہ اختیارات ایک مختصر سے طبقے ہی کو حاصل ہوتے ہیں۔ البتہ ان دونوں میں ایک بنیادی فرق ضرور پایا جاتا ہے کہ اوّل الذکر نظامِ مملکت میں حکمران طبقہ عوامی خواہشات کو بروئے کار لاتا ہے اور مؤخر الذکر نظام میں برسرِ اقتدار گروہ کی مرضی عوام پر بالجبر مسلط کی جاتی ہے۔ آمریت کے پرستاروں نے دورِ جدید میں اپنے طرزِ عمل کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے "تخلیقی اقلیت" (CREATIVE MINORITY) کی حکمرانی کا نظریہ وضع کیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ عوام کالانعام کو کیا معلوم کہ اُن کی بھلائی کن باتوں میں مضمر ہے اور کونسی چیزیں اُن کے حق میں مضر ہیں۔ چنانچہ اُن کے لیے فلاح و کامرانی کا واحد راستہ یہی ہے کہ معاشرے کی "تخلیقی اقلیت" جو فہم و ادراک کی بہترین صلاحیتیں رکھتی ہے قوت و طاقت کے سرچشموں پر قابض ہو کر اور عوامی خواہشات و رجحانات کو بالکل نظر انداز کر کے قوم کو اپنے منشا کے مطابق جس طرف چاہے، ہانک کر لے جائے، اسی میں اُس قوم کی فلاح کا حقیقی راز مضمر ہے۔

کسی مخصوص فرد یا طبقے کی مطلق العنان حکومت کا تصوّر کوئی نیا تصوّر نہیں۔ اِس تصوّر کے مظاہر ماضی میں مصر کے فراعنہ، بابل کے نمارِدہ، روما کے قیاصرہ اور فارس کے اکاسرہ جیسے طاغوتوں میں بآسانی دیکھے جا سکتے ہیں۔ عہدِ حاضر میں یہ تصوّر ہٹلر، مسولینی، لینن اور سٹالن وغیرہ کی بھیانک شکلوں میں نمودار ہوا ہے۔ یہاں ہم اِس امر کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی پوری تاریخ اِس تصوّر سے قطعی ناآشنا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں بلاشبہ بعض بڑے جاہ و حشم کے مالک بادشاہ تخت و تاج پر قابض ہوئے، لیکن اُن کے سارے جاہ و جلال کے باوصف وہ کبھی اِس پندار میں مبتلا نہیں ہوئے کہ وہ قرآن و سنّت

کو پسِ پشت ڈالنے کا حق رکھتے ہیں یا اُن کے احکام اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے مقابلے میں زیادہ واجب التعمیل ہیں۔

یہ "سعادت" آج کے "روشن خیال" انسان کے حصے میں آئی ہے کہ اُس کے ذہن میں جب عوام پر اپنی کبریائی کا ٹھاٹھ جمانے کا سودا سماتا ہے تو وہ مکروفریب اور مختلف قسم کے ناجائز ہتھکنڈوں سے پہلے تو اقتدار پر قابض ہوتا ہے، پھر ملک وقوم کے سارے وسائل، فوج اور انتظامیہ کی بے پناہ قوت سے ناحق فائدہ اُٹھاتے ہوئے پیرِ تسمہ پا بن کر عوام کی گردنوں پر مسلط ہو جاتا ہے۔ اُس کے اِس جارحانہ طرزِ عمل کا سب سے زیادہ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وہ کبھی یہ ماننے پر آمادہ نہیں ہوتا کہ اقتدار کی حد سے بڑھی ہوئی ہوس اُسے ایسا کرنے پر مجبور کر رہی ہے، بلکہ وہ ہر لمحہ قوم پر یہی احسان جتلاتا رہتا ہے کہ وہ حکمران رہنے کی ساری صعوبتیں صرف عوام کی فلاح و بہبود کے لیے جھیل رہا ہے اور اگر اُس نے تختِ اقتدار کو خیرباد کہہ دیا تو آسمان کی ساری آفتیں اور زمین کی تمام مصیبتیں اِس قوم پر اُمڈ پڑیں گی۔

زندگی میں حقیقی سکون چونکہ دلفریب دعووں کی بھرمار سے نہیں، بلکہ اُن دعووں کی عمل کے میدان میں تصدیق سے ہوتا ہے، اِس لیے جلد ہی عوام کے اندر بگڑے ہوئے حکمرانوں کے بارے میں اضطراب پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ وہ دُکھ بھرے دل کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ اُن کی زندگی کسی شدید عذاب میں مبتلا ہو کر رہ گئی ہے۔ اِن نااہل حکمرانوں کی غلط بخشیوں سے جو آبرو باختہ لوگ حکومت میں شریک ہوتے ہیں، اُنھیں قوم و ملک کی بھلائی کا کوئی خیال نہیں ہوتا۔ اُن کی ساری قوتیں یا تو اقتدار کی مرکزی شخصیت کی بے جا مدح سرائی پر صرف ہوتی ہیں یا حکومت سے اپنے اور اپنے متعلقین کے لیے ناجائز فوائد حاصل کرنے میں کھپائی جاتی ہیں اور ملکی ذرائع کو ملت کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرنے کے بجائے بیکار کاموں میں ضائع کیا جاتا ہے۔ یوں تو عوام کا اضطراب زندگی کے ہر شعبہ میں دیکھا جا سکتا ہے، مگر پانچ شعبے ایسے ہیں جن میں اِس کی لہریں بڑی تند و تیز ہوتی ہیں۔

جب بھی تختِ اقتدار پر کوئی فاشسٹ مسلط ہو جاتا ہے تو وہ سب سے پہلے ملک کے امن وامان کو غارت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ انسان فطری طور پر محفوظ و مامون زندگی بسر کرنے کا شدید آرزومند ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اُس کی اور اُس کے خاندان کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ رہیں اور

معاشرہ امن کا گہوارہ ہو تاکہ وہ اپنی صلاحیتیں اعتماد کے ساتھ بغیر کسی ڈر اور خوف کے بروئے کار لا سکے۔ پُرسکون اور پُرامن ماحول میں انسان کے ذہن میں اپنی آزادی وخودمختاری عزتِ نفس اور حقوق کے تحفظ کا احساس پرورش پاتا ہے جو جمہوریت کے لیے آبِ حیات اور آمریت کے واسطے سمِ قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس لیے دُنیا کے ہر آمر کو ہمیشہ یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ جس معاشرے میں اُسے اقتدار حاصل ہوا ہے، اُس میں لوگوں کو بے یقینی کا مُہلک مرض لاحق رہے اور اُنہیں اطمینان کا سانس لینا نصیب نہ ہو کیونکہ یہی وہ مریضانہ ذہنی کیفیات ہیں جن میں انسان مبتلا ہو کر آزادی جیسی متاعِ گرانمایہ کو بھی تیاگ دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ اُسے معاشرے میں کوئی تحفظ حاصل نہیں، تو وہ جان کی امان پانے کی غرض سے فاشزم کی بے رحم جکڑ بندیوں کو بھی گوارا کر لیتا ہے۔ ایسے شخص کا اندازِ فکر اُس بے بس و مجبور انسان کا سا ہوتا ہے جو اپنی جان کے تحفظ کے سلسلے میں ہر طرف سے مایوس ہو کر جیل کی چار دیواری کے اندر پناہ تلاش کرتا ہے۔ اِس لیے جو حکمران ملک کو جیل خانہ بنا کر اُس پر حکومت کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں، وہ پہلے اس بات کا التزام کرتے ہیں کہ ملکی حالات اس حد تک دگرگوں کر دیے جائیں کہ عوام جیل کی زندگی کو آزادی کی زندگی پر ترجیح دینے لگیں۔ دُنیا کے جن ممالک میں بھی فاشزم کا تسلط ہوا اُن میں امنِ عامہ کی صورتِ حال یا پہلے سے ناگفتہ بہ تھی یا جان بوجھ کر اِس قدر ناگفتہ بہ بنا دی گئی کہ عوام نے جان و مال کے تحفظ کی خاطر بحیثیت ایک قوم قید بامشقت کی زندگی بسر کرنا گوارا کیا۔

فاشزم کے خطرے کی دوسری بڑی علامت یہ ہے کہ عوام کا عدل و انصاف کے مقدس اداروں پر سے ایمان متزلزل ہونے لگتا ہے۔ جمہوری ممالک میں عدالتیں لوگوں کی آزادی کی ضامن اور اُن سے روا رکھی گئی ناانصافیوں کو دُور کرنے اور اُنہیں انصاف دلانے کا سب سے مؤثر ذریعہ خیال کی جاتی ہیں۔ ظاہر بات ہے وہ یہ فرائض اسی صورت میں سرانجام دے سکتی ہیں جب وہ آزاد اور خودمختار ہوں اور حکومت اور انتظامیہ کی طرف سے اُن پر کوئی دباؤ نہ ڈالا جا سکے۔ دوسرے عدالت کی کرسیوں پر ایسے بااخلاق، صاحبِ عزم، قانع اور عدل پسند ماہرینِ قانون فائز ہوں جنہیں کوئی دُنیوی ترغیب و ترہیب جادۂ مستقیم سے ہٹا نہ سکے۔ وہ معاشرے میں ایسے باوقار انسان کی حیثیت سے زندہ رہیں

جن پر کوئی فرد یا ادارہ ، خواہ اس کی حیثیت کتنی ہی اُونچی کیوں نہ ہو ، کسی قسم کا دباؤ ڈالنے کی جرأت نہ کر سکے اور اگر کبھی انہیں ایسی صورتِ حال پیش آجائے تو وہ پورے عزم اور پامردی کے ساتھ اُس کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں ۔ عدالت کسی ملک میں ستم زدہ کی دُنیوی اعتبار سے آخری پناہ گاہ ہوتی ہے جس کی طرف وہ دادرسی کے لیے رجوع کرتا ہے ، اور اگر اس کے بارے میں مظلوموں کے اندر یہ تاثر پھیل جائے کہ وہ اُن کی مظلومیت کا کوئی مداوا نہیں کرسکتی تو اُن کے ذہنی کرب اور یاس و ناامیدی کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے ۔

جس ملک کے عوام کو عدالتوں سے انصاف کی کوئی توقع باقی نہ رہے ، اُن کے اندر آزادی اور اس کے تحفظ کی کوئی امنگ باقی نہیں رہتی اور وہ اپنے مستقبل سے مایوس ہوکر اپنے آپ کو انتظامیہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ اُن کی نگاہ میں اُس کی قوت ہی ملک کی سب سے غالب اور فیصلہ کن قوت ہوتی ہے جس کے اشارے پر تمام معاملات طے کیے جاتے ہیں ۔ عوام کا یہ طرزِ فکر کسی قوم کے اندر فاشزم کے تسلط کی راہ ہموار کرتا ہے ۔

فاشزم جیسے انسانیت کش نظام کو اُس بدنصیب ملک پر قبضہ جمانے کا موقع ملتا ہے جس میں عوام اصولوں سے وابستہ ہونے اور ان کا علم بلند کرنے کے بجائے بعض مخصوص افراد کی ذہنی غلامی میں گرفتار ہوکر ان کی شخصیتوں کو مصنوعی طریقوں سے اُبھارنے میں مصروف ہوجائیں ۔ اصول پسندی کی فضا میں افراد اُس حد تک قابلِ تعظیم تصور کیے جاتے ہیں جس حد تک وہ اصولوں کے پابند ہوں اور انہیں سربلند رکھنے کے لیے سعی و جہد کریں ۔ اس فضا کے اندر اصولوں ہی کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور پوری قوم ان کی عملداری قائم کرنے کے لیے سرگرم عمل ہوتی ہے ۔ یہ فضا جمہوریت کے فروغ کے لیے بڑی سازگار ہوتی ہے ۔

اس کے مقابلے میں جب کسی قوم کے سیاسی افق پر فسطائیت کے مہیب سائے پھیلنے شروع ہوجائیں تو وہاں شخصیت پرستی کی وبا پھوٹ پڑتی ہے ۔ عوام کے سامنے چند شخصیتیں "نجات دہندوں" کی حیثیت سے بڑے طمطراق کے ساتھ نمایاں ہوکر آتی ہیں اور وہ لاف زنی ، سنسنی خیز بیانات ، جذباتی نعروں اور نمائشی سرگرمیوں کے زور سے عوام کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہیں ۔

چونکہ ان "نجات دہندوں" کا واحد مقصد اپنی شخصیت کے سحر سے تخت اقتدار پر بلا شرکتِ غیرے تاحینِ حیات قابض رہنا ہوتا ہے اس لیے وہ اس بات کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں کہ عوام کے دل و دماغ میں اُن کے مافوق البشر ہونے کا تاثر قائم رہے اور یہ تاثر عقیدہ کی سی شدت، گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ان کے اذہان پر اس طرح مستولی ہو جائے کہ اُن کے دلوں میں کبھی اس بات کی خواہش ہی پیدا نہ ہونے پائے کہ وہ فوق البشر کی کارگزاریوں کا حقیقت پسندانہ جائزہ لے سکیں یا اس نہج پر سوچنے کی جراٴت کر سکیں کہ اُن کے ملک کے سربراہ سے کوئی خطا بھی ہو سکتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ "فوق البشر" کا یہ طلسم اس ماحول میں تو قائم نہیں رہ سکتا جس میں عوام کو اپنے حکمرانوں پر احتساب کی آزادی ہو۔ لہٰذا جو لوگ بھی "فوق البشر" بننے کا داعیہ لے کر اُٹھتے ہیں وہ ایک طرف تو ملک کے اندر تنقید و احتساب کے سارے دروازے مسدود کر دیتے ہیں اور دوسری طرف اس بات کا پورا پورا التزام کرتے ہیں کہ قوم کے سارے ذرائع ابلاغ اُن کی شخصیت کا نقش اُبھارنے میں بے دریغ استعمال کیے جائیں۔ جب عوام کی نگاہیں کسی اخبار پر پڑیں تو وہاں انہیں فوق البشر کی دلآویز تصویروں، اُس کے وجد آفرین پیغامات اور دل فریب بیانات اور اس کے محیر العقول کارناموں کے ذکر کے علاوہ کوئی چیز نہ ملے۔ جب ریڈیو سُنا جائے تو اس میں صرف اُس ذات شریف کا تذکرہ ہی ہو اور جب ٹیلیویژن دیکھا جائے تو اس کی سکرین پر اس کی شخصیت اپنی ساری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آئے۔ اور اس طرح عوام کے دل و دماغ میں یہ بات اچھی طرح راسخ ہو جائے کہ اُن کی پوری قوم فکر و عمل کے اعتبار سے بالکل تہی دست اور قلاش ہے۔ بس ایک فوق البشر کی مقدس ذات ہی ہے کہ جس کی غیر معمولی صلاحیتوں اور جس کے بے پناہ جذبۂ عمل و ایثار کی وجہ سے قوم زندہ ہے۔ اس بنا پر اس کے درمیان اس فوق البشر کا وجود خدا کی بے پایاں عنایات میں سے ایک بہت بڑی عنایت ہے جس کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے اور اگر خدانخواستہ تخت اقتدار اس کے بابرکت وجود سے خالی ہو گیا تو پھر قوم کا زندہ رہنا ممکن نہ رہے گا۔ لہٰذا اس کی فلاح و بقا کا راز صرف اس بات میں مضمر ہے کہ وہ اس فوق البشر کو تخت اقتدار پر ہمیشہ کے لیے براجمان رکھے اور اس کی غیر مشروط اطاعت پر ہر لمحہ کمربستہ رہے اور اُسے اپنی سب سے بڑی کامیابی تصور کرے۔

ہر فاشسٹ حکمران پروپیگنڈا کے فن میں ماہر و مشاق ہونے کے علاوہ اس بات کا بھی خاص طور پر اہتمام کرتا ہے کہ وہ ایسے کارنامے سرانجام دے یا اس کی ایسی کارگزاریاں عوام کے سامنے لائی جائیں جو قومی فلاح و بہبود کے نقطۂ نظر سے خواہ کسی معمولی اہمیت کی بھی حامل نہ ہوں مگر سنسنی خیزی پیدا کرنے کے لیے غایت درجہ کارآمد ہوں۔ دُنیا ٹھوس حقائق سے عبارت ہے اس لیے جھوٹی کارروائیوں کی حقیقت جلد ہی کھل کر سامنے آجاتی ہے اور عوام کے اندر یاس و قنوطیت پھیلنا شروع ہو جاتی ہے۔ اس لیے فاشزم کا ہر علمبردار قوم کے گرتے ہوئے اعتماد کو سہارا دینے کے لیے زیادہ سنسنی خیز باتیں کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنی فکری لغزشوں اور میدان عمل میں اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کو کھوکھلے نعروں، دل فریب وعدوں اور سطحی کارناموں اور نمائشی قسم کی سرگرمیوں سے پورا کریں کیونکہ ان اخلاق سوز حربوں سے ہی ان کی شخصیت کا طلسم کچھ دیر تک قائم رکھا جا سکتا ہے۔

علاوہ ازیں فاشسٹ نظام اُسی ملک میں کامیابی کے ساتھ اپنے قدم جما سکتا ہے جو اچھی اور صحت مند روایات کے اعتبار سے یا تو بالکل ویرانہ ہو یا جھوٹے پروپیگنڈے کی مدد سے ان روایات کے خلاف ایک ایسی معاندانہ فضا قائم کر دی جائے جس میں یہ دم توڑ جائیں اور عوام ان روایات کو تلخ یادیں کہہ کر اپنوں ذہنوں سے محو کر دیں۔ فاشزم عام طور پر قابل قدر روایات کے لاشوں پر سے گزر کر ہی آتا ہے۔ آپ نازی جرمنی کو دیکھیے کہ وہاں یہ نظام کس طرح برپا کیا گیا۔ یورپ کی دیگر قوموں کی طرح اہل جرمن میں بھی مسیحی روایات کا احترام موجود تھا۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ جب کوئی قوم صحت مند روایات سے وابستہ ہو تو اُسے اپنی اجتماعی زندگی کے لیے قانونی جکڑ بندیوں کی زیادہ ضرورت پیش نہیں آتی اس لیے وہاں کے عوام میں آزادی کا شعور پرورش پاتا ہے۔ فاشزم کے داعیوں نے جب جرمنی پر یہ نظام مسلط کرنے کا ارادہ کیا تو سب سے پہلے مارٹن لوتھر کی تحریکِ اصلاح مذہب کے ذریعے مسیحی روایات کو اتنی بے دردی سے پامال کیا کہ اُن کے اندر کوئی جان باقی نہ رہی۔ جس رفتار سے عوام پر ان روایات کی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی اسی رفتار سے ان کا قومی شیرازہ منتشر ہونے لگا، اور جرمن قوم کو اس بات کا شدید خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں اس کا قومی وجود ہی فنا نہ ہو جائے۔ اس لیے اسے اپنی شیرازہ بندی کے لیے ایک ایسے مضبوط ہاتھ کی احتیاج محسوس ہوئی

جس کی غیر معمولی گرفت اس کے مائل بہ انتشار اجزاء کو پوری قوت کے ساتھ ایک دوسرے سے وابستہ رکھ سکے۔ یہ قومی روایات سے اس بغاوت کا نتیجہ تھا کہ المانیہ کی سرزمین پر فاشزم کو تسلط کا موقع حاصل ہوا۔

روس ایک ایسا ملک ہے جس میں اشتراکیت کے نام پر فاشسٹ نظام کو پوری قوت سے پروان چڑھایا گیا ہے۔ اشتراکی انقلاب سے پہلے اس میں وہ سارے حالات موجود تھے جو فاشزم کو سازگار ماحول فراہم کرتے ہیں۔ یہاں اچھی اور صحت مند روایات کا بالکل فقدان تھا۔ حکمران ٹولے کے ظلم واستبداد اور اس کی ریشہ دوانیوں اور زیر دست آزاریوں کی وجہ سے نچلے طبقے کی زندگی بالکل عذاب بن کر رہ گئی تھی۔ یاس اور نا امیدی کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں انہیں دُور دُور تک روشنی کی کوئی کرن نظر نہ آتی تھی۔ وہ اپنے سامنے کوئی راہ نجات نہ پاتے تھے۔ ان اندوہناک حالات میں جب انہوں نے استحصالی قوتوں کے خاتمے کا مژدۂ جانفزا سنا تو ان کے اندر زندگی کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے بے خبری کے عالم میں خود آگے بڑھ کر فسطائی نظام کی علمداری قبول کی۔ اگر وہاں کے عوام کسی صحت مند نظام حیات سے عملی طور پر کچھ بھی آشنا ہوتے اور اس کی پسندیدہ روایات ان کے رگ وپے میں سرایت کیے ہوتیں تو وہ ان دونوں نظاموں کے مصائب اور محاسن کا پوری طرح موازنہ کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کن قدم اٹھاتے۔ لیکن چونکہ روس میں کوئی حیات آفرین نظام فکر وعمل پہلے سے موجود ہی نہ تھا اس لیے خانۂ خالی را دیو ان می گیرد کے مطابق وہاں فاشزم نے قبضہ کر لیا۔

فاشزم کے تسلط کے سلسلے میں یہ بات بھی مشاہدہ میں آئی ہے کہ یہ جابرانہ نظام اُسی معاشرے میں غلبہ حاصل کرتا ہے جو انسانی تمناؤں اور آرزوؤں کا مرگھٹ ہو، جس میں لوگوں کی عظیم اکثریت وقوف وآگہی سے عاری ہو چکی ہو، جہاں خود غرضی، طمع، لالچ جیسے اخلاقی عیوب نے عوام کو زندگی کے اعلیٰ وارفع مقاصد سے یکسر ناآشنا کر دیا ہو۔ اور اس طرح معاشرے کے اجتماعی ضمیر میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہ رہی ہو اور لوگ گھٹیا مفادات کی خاطر اپنی خود داری، عزت نفس حتیٰ کہ اپنی قومی آزادی کا سودا کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ کوئی قوم جب تک حیوانیت کی پست سطح سے اتر کر زندگی بسر کرنا گوارا نہیں کرتی وہ فاشزم کے فروغ کے لیے سازگار ماحول فراہم نہیں کر سکتی۔ فاشزم کا (باقی بر صفحہ ۴۸)

(بقیہ اشارات) قفس بالعموم تہذیب و تمدّن کے کھنڈرات اور روحانی اقدار کے ملبہ پر ہی اُٹھایا جاتا ہے۔ اس لیے جب بھی کوئی شخص فاشزم کا علمبردار بن کر اٹھتا ہے تو وہ سب سے پہلے اس قوم کی تہذیبی اور روحانی اقدار کو تباہ کرتا ہے تاکہ اُس کے افراد کا نقطۂ نگاہ صرف جیب اور پیٹ کی ضروریات تک محدود ہو کر رہ جائے اور ان میں جنسی لذات سے بلند ہو کر کسی اعلیٰ نصب العین کے متعلق سوچنے کی خواہش، ہمت اور صلاحیت باقی نہ رہے۔

(بقیہ روداد ابتلاء: احمد رائف مصری)

میں سے ہیں مثلاً جمعیت الصراط المستقیم، مُردے دفن کرنے کی رفاہی انجمن، جمعیت شرعیہ، تبلیغی اسلامی جمعیت، اور بھی بہت سی جماعتیں۔ کچھ افراد حزب التحریر الاسلامی کے بھی تھے۔ اخوان المسلمون کے افراد ان سب سے زیادہ۔ درحقیقت یہ قضیہ ہی اخوان سے منسوب تھا۔ کچھ افراد ایسے بھی تھے جن کا رشتہ کسی مذہبی یا غیر مذہبی تنظیم یا ادارے سے نہیں تھا۔ لیکن اُن کی رشتہ داری ایسے لوگوں سے تھی جو کسی نہ کسی جماعت سے وابستہ تھے۔ اسی لیے وہ بھی دھر لیے گئے۔ مزید برآں ایسے لوگوں کی بھی ایک تعداد یہاں محبوس تھی جو نہ خود کسی چیز سے وابستگی رکھتے تھے اور نہ وابستگانِ دین و سیاست سے ان کو کوئی غرض تھی۔ ایسے افراد کے وجود پر ہم بارہا انگشتِ حیرت منہ میں لیتے رہے —— مگر یہ حیرت زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔

پہلی رات ہم نے تعارف، تبادلۂ خیال اور تبادلۂ لطائف میں گزاری۔ اور قلعہ میں جو چند ... لوٹے اُن کا تذکرہ چھیڑا کیے —— میں تو یہ گمان کرتا تھا کہ ہم قلعہ کے رنج و محن کی یادوں میں گھرے رہیں گے۔ اس لیے کہ ان رنج و محن کا مجرّد خیال ہی ہماری عقل و فکر کو ماؤف کر دیتا تھا۔ ہمارے جسم اور چیتھڑوں پر اُن کے نشانات چمک رہے تھے۔ یہ رستے ہوئے زخم، یہ خون کے لالہ گوں دھبّے اور یہ لاجوردی لکیریں کس شدت کے ساتھ قلعہ کی یادوں کو تازہ رکھے ہوئے تھیں۔ الغرض قلعہ میں ہم نے جو چند روز گزارے ذہن بلبلا بلبلا کر کہہ رہا ہے کہ وہ چند دن نہیں تھے صد سالہ دورِ چرخ تھا۔ مگر اس سب کے باوجود ہم خوش گفتاری اور لطیفہ بازی پر آ گئے۔ یہ عمارت جس میں ہم آج اُترے گئے ہیں بالکل نئی ہے اور بڑی نفیس و پُر رونق۔ (باقی)